اعتراف

سلیم الحق حقی

آج کا ایک اہم مسئلہ آدمی کی شناخت بھی ہے جو روز بروز مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کسی شخص کا ظاہر دیکھ کر اس کے بارے میں جو رائے قائم کرتے ہیں، اکثر کسوٹی پر پرکھنے کے بعد وہ درست ثابت نہیں ہوتی لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے باوجود ہم ظاہر پر ہی بھروسہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں

ایک شخص کا احوال جو اعتراف کی رات قبرستان میں موجود تھا

میں نے اسے دیوانہ وار چاہا تھا.... دیوانگی کی آخری حد تک۔

آدمی محبت کیوں کرتا ہے؟ کیوں کرتا ہے وہ محبت؟ اور محبت کیا ہے؟ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی محبت کرتا ہے تو اسے دنیا میں ایک ہستی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ذہن میں ایک ہی خیال جاگزیں رہتا ہے۔ دل میں ہمیشہ ایک ہی خواہش سر کشیدہ رہتی ہے۔ ہونٹوں پہ ایک ہی نام کی پکار اُبھرتی ہے اور وہ ایک نام تسلسل کے ساتھ لبوں کو چھوتا ہے۔ پہاڑ کے سنگی سینے میں منبع پانے والے چشمے کے پانی کی طرح روح کی انتہائی گہرائیوں سے وہ نام ہونٹوں تک آتا ہے اور ہونٹ اسے بار بار دہراتے ہیں، ہر جگہ، ہر طرف، سرگوشی میں، جیسے وہ نام نہیں کوئی دعا ہو۔

میں آپ کو اپنی بلکہ ساری دنیا کی کہانی سنا رہا ہوں، کیونکہ محبت

کی تو ایک ہی کہانی ہے۔ ہر خطے میں اس کا ایک ہی روپ ہے۔ میں اس سے ملا، میں نے اسے چاہا، میں زندہ رہا تو اس کی محبت اور اس کی نرمی اور مہربانی کے زور پر۔ میں اس کے لمس کے سہارے، اس کی بانہوں میں، اس کے لفظوں میں یوں کھو گیا کہ مجھے دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہا۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ دن ہے یا رات۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔ میں تو اس بوڑھی دھرتی پر اس کی محبت کے سحر میں گم تھا۔ یہ بے خودی، یہ از خود رفتگی صرف محبت ہی میں ممکن ہے اور یہی محبت کی کہانی ہے۔ اس زمین پر، اس آسمان کے نیچے، خواہ مقام کوئی بھی ہو۔

اور پھر وہ مرگئی۔ کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ اب تو میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ ایک شام وہ گھر واپس آئی تو بری طرح بھیگی ہوئی تھی کیونکہ اس روز موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ اگلے روز اسے کھانسی ہو گئی۔ وہ تقریباً ایک ہفتہ کھانستی رہی اور بستر سے لگ گئی۔ پھر کیا ہوا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ ڈاکٹر آئے، انھوں نے نسخے لکھے، دوائیں تجویز کیں اور چلے گئے۔ دوائیں لائی گئیں اور کچھ عورتوں نے، جو اس کی تیمارداری کر رہی تھیں، اسے وہ دوائیں پلائیں۔ اس کے ہاتھ گرم تھے۔ اس کی پیشانی جل رہی تھی، اس کی آنکھوں میں بخار کی وجہ سے شعلگی تھی اور گہری اداسی تھی۔ میں نے اس سے باتیں کیں، اس نے جواب دیے، لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟ میں ہر بات بھول گیا ہوں، ہر بات... ہر بات... وہ مرگئی اور مجھے اس کی وہ مدھم، دبی دبی آخری آہ خوب یاد ہے۔ پھر نرس نے کہا "آہ" اور میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔

اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پادری نے مجھ سے پوچھا "تمھاری صرف دوست تھی وہ؟" اور مجھے ایسا لگا کہ وہ اس کی توہین کر رہا ہے۔ اب جبکہ وہ مرچکی تھی، تو کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں تھا۔ میں نے پادری کو نکال دیا۔ پھر ایک اور پادری آیا۔ وہ نرم دل اور مہربان تھا۔ اس نے اس کے متعلق باتیں کیں تو میں خوب رویا، دل کھول کر رویا۔ تدفین کے موقع پر مجھ سے مشورہ لیا گیا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ لوگوں نے مجھ سے کیا کہا۔ البتہ مجھے اس کا تابوت یاد ہے۔ ہتھوڑے کی اس وقت کی آواز یاد ہے، جب وہ اسے تابوت میں رکھ کر کیلیں ٹھونک رہے تھے۔ میرے خدا! اوہ میرے خدا!

وہ دفن کر دی گئی، دفن، اس اندھیری قبر میں وہ گل بدن، سیم تن، اس قبر میں اتار دی گئی۔ کچھ لوگ تعزیت کے لیے آئے۔ ان میں اس کی سہیلیاں بھی تھیں۔ میں ان سے بچ کر نکل آیا۔ میں بھاگا، میں بھاگتا رہا۔ رات، بہت رات گئے میں گھر واپس آیا اور اگلے روز سفر پر روانہ ہو گیا۔

کل میں پیرس واپس آیا۔ میری اپنے کمرے، ہمارے کمرے، ہمارے بستر، ہمارے فرنیچر، ہر اس چیز پر۔ جو انسان کے مرنے کے بعد اس کی علامت کے طور پر رہ جاتی ہے، نظر پڑی تو میرا دکھ شدید تر ہو گیا۔ درد نے شدت سے میرے وجود میں اپنے نکیلے دانت گاڑ دیے۔ اذیت اتنی شدید تھی کہ میرا جی چاہا کھڑکی کھولوں اور نیچے کود جاؤں، مرجاؤں۔ میں ان چیزوں کے، ان دیواروں کے درمیان نہیں رہ سکتا تھا، جنھوں نے اسے پناہ دی تھی۔ جن کے روزنوں میں اس کے وجود کے ہزاروں ذرّے تھے، اس کی جلد کی شہابی رنگت تھی اور اس کی سانسوں کی مہک تھی۔ میں نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور وہاں سے فرار ہونے کے لیے لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے ہال میں آویزاں وہ قدِ آدم آئینہ نظر آیا۔ وہ آئینہ اسی نے لگوایا تھا تاکہ کہیں جانے سے پہلے اپنا، اپنے میک اپ اور اپنے لباس کا جائزہ لے سکے کہ کہیں کوئی خامی تو نہیں ہے۔

میں اس آئینے کے سامنے ٹھٹک گیا، جس میں اس نے بارہا اپنے سراپا کو دیکھا تھا، اتنی کثرت سے کہ مجھے گمان ہوا، ممکن ہے آئینے میں اب بھی اس کا عکس موجود ہو۔ میں آئینے پر نظریں جمائے کھڑا، پوری جان سے لرزتا رہا۔ آئینہ گہرا، سپاٹ اور خالی نظر آیا۔ اس آئینے نے بھی اسے ان گنت بار اپنی آغوش میں بھرا تھا۔ اس کے وجود کو اپنے اندر سمیٹا تھا۔ اس نے بھی اسے ہر ہر زاویے سے دیکھا تھا، میری محبت کرنے والی نگاہوں کی طرح۔ اس لمحے مجھے اس آئینے سے بے اندازہ محبت محسوس ہوئی۔ میں نے آئینے کو چھوا۔ وہ بالکل سرد تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ آئینے سوگوار بھی ہوتے ہیں، ہجر میں سلگتی آنکھوں کی طرح جلتے بھی ہیں اور اجاڑ اور خوفناک بھی ہوتے ہیں۔ خوش صرف وہی لوگ رہتے ہیں، جو بھول جائیں کہ آئینے نے ماضی میں، اپنی آغوش میں کیا کچھ سمیٹا تھا۔ جو ماضی کو بھول جاتے ہوں۔ مجھے تو اس آئینے میں جگنوؤں کی طرح اڑتے ہوئے لمس، اور تتلیوں کی طرح تھرکتی ہوئی دھنک رنگ محبت نظر آ رہی تھی۔ وہ جامِ جہاں نما نہیں، جامِ عشق نما تھا۔

آہ، اس آئینے نے مجھے کیسا دکھی کر دیا تھا۔

میں باہر نکل آیا، بغیر باہر نکلنے کی خواہش کے اور مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میں کس طرف چل دیا ہوں۔ مجھے علم نہیں ہوا کہ میں قبرستان کی طرف جا رہا ہوں۔ اس خاموش بستی کی طرف، جہاں وہ جا بسی ہے۔

میں اس کی سادہ قبر پر پہنچا۔ قبر پر سفید ماربل کی صلیب نصب تھی اور اس پر لکھا تھا:

اس نے محبت کی، وہ چاہی گئی اور مرگئی۔

وہ اس گہری قبر میں دفن تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا پھول بدن مرجھا رہا ہوگا۔ ترشی ہوئی مورت پر فرسودگی کا عذاب اتر رہا ہوگا۔ گہرے دکھ نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی

ینک ، بہت دیر تک اسی حال میں رہا۔ پھر میں نے اندھیرا
ہوتے دیکھا۔ شہرِ خموشاں پر اندھیرا ابھی چپ چاپ دبے پاؤں اتر رہا
تھا کہ سکوت آشنا بستی کے باسیوں کا سکون درہم برہم نہ ہو۔
اچانک ایک عجیب اور دیوانگی پر مبنی خواہش نے مجھے جکڑ لیا۔
یسی خواہشیں مایوس عشاق کے گداز سینوں ہی میں نمو پا سکتی ہیں۔
یں نے سوچا، چاہا کہ وہ رات میں قبرستان ہی میں گزاروں، رو رو
ر اس کی قبر بھگو دوں، لیکن خدشہ یہ تھا کہ مجھے دیکھ لیا جائے گا اور
یں زبردستی وہاں سے نکال دیا جاؤں گا۔ اس صورتِ حال سے بچاؤ
ی کوئی تدبیر کرنا تھی۔ میں نے چالاکی سے کام لیا۔ وہاں سے اٹھا
ور شہرِ خموشاں کی کوچہ نوردی شروع کر دی۔ میں چلتا رہا، چلتا گیا۔
شہر اس شہر کے مقابلے میں کتنا چھوٹا ہے، جس میں ہم زندہ لوگ رہتے
یں، لیکن اس کی آبادی ہمارے شہر کے مقابلے میں کتنی زیادہ ہے۔
یں بڑے بڑے مکانات اور کشادہ سڑکیں درکار ہوتی ہیں۔ ہماری
ن نسلیں ایک ساتھ ملتی ہیں۔ ایک ساتھ سورج کو طلوع و غروب
ہوتے دیکھتی ہیں۔ ان سبھوں کو پانی پینے کے لیے میٹھے چشموں کی اور
شراب کے لیے انگور کی بیلوں کی اور کھانے کے لیے زمین سے غلّے کی
ضرورت ہوتی ہے اور یہ تمام مردہ نسلیں جو انسانیت کے نینے کی
حیثیت رکھتی ہیں، انھیں کچھ بھی تو درکار نہیں ہوتا۔ زمین انھیں واپس
لے لیتی ہے اور انھیں گھپ اندھیرے میں رہنا ہوتا ہے۔
میں قبرستان کے افتادہ ترین حصّے تک آ گیا تھا۔ اچانک مجھے
حساس ہوا کہ یہ قبرستان کا قدیم ترین حصّہ ہے۔ یہاں وہ لوگ رہتے ہیں
جو بہت پہلے ...... مدتوں پہلے یہاں آباد ہوئے تھے۔ جن کے جسموں
کا گوشت اب مٹی میں گھل مل گیا ہو گا۔ قبروں پر کھڑی صلیبیں فرسودگی
کی زد پر تھیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ آنے والے دنوں میں اس
جگہ نئے آنے والوں کو آباد کیا جائے گا۔ وہ جگہ خود رو جنگلی گلاب کی
جھاڑیوں اور شمشاد کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ وہ ایک اداس مگر
خوبصورت باغیچہ تھا، جس کی نمو انسانی گوشت کی مرہونِ منت تھی۔
میں وہاں تنہا تھا... بالکل تنہا۔ میں ایک درخت کے نیچے
گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا
تھا۔ میں اس درخت کے تنے سے یوں لپٹا ہوا تھا، جیسے کوئی
ڈوبتا آدمی پتوار کو تھامتا ہے۔
اندھیرا دبیز تر ہوا تو میں وہاں سے اٹھ گیا اور دبے قدموں
چلنے لگا کہ کہیں صدیوں کی نیند میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی نیند
میرے قدموں کی چاپ سے نہ اُچٹ جائے۔ میں تا دیر بھٹکتا پھرا،
مگر اس کی قبر مجھے نہیں ملی۔ میں ہاتھ پھیلائے، ٹٹول ٹٹول کر مقبروں
سے ٹکراتا بڑھتا رہا۔ لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ پہلی بار مجھے احساس
ہوا کہ شہرِ خموشاں زیادہ بڑا شہر ہے۔ یہاں کسی کا پتا نہیں ملتا اور

کوئی پہچاننے والا بھی نہیں ہوتا جیسا کسی اندھے کی طرح راستہ ٹٹول رہا تھا، ٹھوکریں کھا رہا تھا، انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں اور کئی بار قبروں سے میرا سر ٹکرا چکا تھا۔ میں انگلیوں سے ٹٹول کر کتبوں کے نام پڑھ رہا تھا۔ عجیب رات تھی وہ، بے حد عجیب رات۔ ایسا لگتا تھا کہ اب میں اس کا مہمان نہیں ہو پاؤں گا۔ اس کا نیا گھر مل ہی نہیں رہا تھا۔

وہ تاریک رات تھی۔ چاند بھی نہیں نکلا تھا۔ اب میں قبروں کے درمیان تنگ کچے راستے پر چلتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ قبریں ہی قبریں، ہر طرف قبریں۔ وہاں قبروں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ میرے دائیں، میرے بائیں، میرے سامنے، میرے پیچھے، میرے اطراف میں قبروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں تھک گیا۔ مزید ایک قدم چلنا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ میرے گھٹنے لرزنے لگے۔ چنانچہ میں ایک قبر پر بیٹھ گیا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں، لیکن پھر میں نے دھڑکنوں کے سوا بھی کوئی آواز سنی۔ کیا؟ وہ کوئی بے نام سی آواز تھی، بے مفہوم آواز۔ میں سوچنے لگا کہ یہ آواز کہیں میرے دکھ سے بوجھل سینے کی بے آواز آہ تو نہیں، میرے آزار زدہ ذہن کا کرشمہ تو نہیں یا یہ انسانی اسرار چھپانے والی زمین کے سینے سے ابھرنے والی آواز ہے؟ میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن جہاں میں بیٹھا تھا، وہاں سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ دہشت کے مارے میں ساکت ہو گیا۔ خوف نے مجھے ٹھٹھرا دیا۔ میں چیخ سکتا تھا، اس لمحے میں مر سکتا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں مرمر کی جس سل پر بیٹھا ہوں، وہ حرکت کر رہی ہے۔ ہاں، واقعی وہ سل متحرک ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اٹھ رہی ہے۔ میں بری طرح اچھلا اور برابر والی قبر کی طرف لپکا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میں نے دیکھا اور واضح طور پر دیکھا کہ جس سل پر میں بیٹھا تھا، وہ اٹھ رہی ہے۔ پھر ایک مردہ قبر میں سے نکلا۔ وہ ایک بے لباس ڈھانچہ تھا۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی پیٹھ کی ہڈیوں سے سل کو اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ رات بہت تاریک تھی، لیکن میں نے یہ سب کچھ بہت واضح طور پر دیکھا۔ میں نے مرمر کی صلیب پر کندہ عبارت پڑھی۔ لکھا تھا:

یہاں جیکوگس اولیور نٹ ولن ہے جس نے ۵۱ سال زندگی گزاری۔ وہ اپنے گھر والوں سے محبت اور ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ مہربان، شریف اور معزز تھا اور اس نے خدا کی مرضی اور مہربانی سے وفات پائی۔

ڈھانچے نے بھی وہ عبارت بغور پڑھی۔ پھر اس نے راستے میں پڑا ہوا ایک نکیلا پتھر اٹھایا اور آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے ایک ایک حرف کھرچ کر مٹانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صلیب صاف ہو گئی۔ وہ چند لمحے اپنی کھوکھلی خالی آنکھوں سے اس جگہ کو تکتا رہا جہاں وہ حرف موجود رہے تھے۔

پھر اس نے اپنی انگشتِ شہادت سے [illegible] کی لوح سے [illegible] ... [illegible] پر [illegible] ... اس نے اپنے [illegible] ... اپنے [illegible] ... ان [illegible] ... کو دھوکے [illegible] ... اسے [illegible] کے عالم میں وفات آئی۔

یہ لکھنے کے بعد ڈھانچہ بے حس و حرکت کھڑا اپنی کارستانی کو دیکھتا رہا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو چاروں طرف ساری قبریں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سے مردے باہر نکل آئے ہیں۔ پھر وہ سب اپنی اپنی صلیبوں پر لکھی ہوئی عبارتیں مٹانے اور ان کی جگہ حقیقتیں لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ عبارتیں جو ان کے لواحقین نے ان سے محبت کرنے والوں نے صلیبوں پر کندہ کرائی تھیں، سچی نہیں تھیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ وہ سب ہمسایوں کو ستانے والے، بدنیت، بددیانت، منافق، جھوٹے، حاسد، ٹھگ اور مجرم تھے۔ پرانی عبارتوں کے مطابق ان میں اچھے باپ تھے، وفادار بیویاں، محبت کرنے والے بیٹے، باعصمت بیٹیاں اور دیانت دار کاروباری تھے، لیکن اب وہ سب اپنی خوف ناک اور مکروہ سچائیاں لکھ رہے تھے۔ دنیا کی کوئی برائی، کوئی گناہ ایسا نہیں تھا، جو انھوں نے نہ کیا ہو لیکن ان کے قریبی لوگ یا ان سچائیوں سے بے خبر تھے یا انھوں نے خود کو بے خبر ظاہر کیا تھا۔ اس روز پہلی بار مجھے علم ہوا کہ مرگِ بد کا احترام کیوں ہے اور دفن کرنا مشکل کام ہے۔

میں نے سوچا، اس نے بھی اپنی صلیب پر یقیناً کچھ نہ کچھ لکھا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں ان مکروہوں کے درمیان بھاگتے ہوئے اس کی قبر تلاش کرنے لگا۔ اب مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ اس بار مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے مل جائے گی اور میں نے اسے پہلی ہی نظر میں، بغیر اس کا چہرہ دیکھے پہچان لیا۔ اس کا چہرہ کفن کی چادر میں لپٹا ہوا تھا اور سفید ماربل کی جس صلیب پر کچھ پہلے میں نے یہ عبارت پڑھی تھی۔

اس نے محبت کی، وہ چاہی گئی اور مر گئی۔

وہاں اب یہ عبارت لکھی تھی:

ایک دن موسلا دھار بارش میں یہ عورت اپنے محبوب سے بے وفائی کے لیے نکلی تھی۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے نمونیا ہوا اور مر گئی۔

مجھے بعد میں پتا چلا کہ لوگوں نے اگلی صبح مجھے اس کی قبر پر بے ہوش پڑے پایا تھا۔

WAS IT DREAM
Guy De Maupassant.